ابتدائیہ

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، جس کا قیام ۱۹۷۹ء میں اسلام آباد میں عمل میں آیا تھا ابتداء سے ہی اہم ملکی اور قومی مسائل پر تحقیق و جستجو اور مذاکروں اور سیمینارز کا انعقاد کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہ خصوصی سلسلۂ خطابات اپنا ایک مخصوص تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ اس کا تعلق ایک انتہائی عزیز اور قریبی تحریکی بھائی خرم مراد کی یاد سے ہے، جن کا شمار اس ادارے کے بانیوں اور ابتدائی رفقاء میں ہوتا ہے خرم مراد دسمبر ۱۹۹۶ء میں اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ انسٹی ٹیوٹ نے ان کی یاد میں اور ان کی خدمات کے اعتراف میں ہر سال ان کی دلچسپی کے موضوعات پر اہل علم و فضل کے خطبات کا اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ معروف اور ممتاز دانشور اور ڈپلومیٹ ڈاکٹر مراد ہوف مین اس لیکچر سیریز کے پہلے مقرر ہیں۔

خرم مراد نے اپنی پوری زندگی امت مسلمہ کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ آپ تیس سے زیادہ علمی، تحقیقی اور دعوتی نوعیت کی اعلیٰ پائے کی کتب کے مصنف ہیں۔ ترجمان القرآن جیسے علمی رسالے کے ایڈیٹر رہے، جس کا اجراء سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا تھا۔ اس رسالے نے گزشتہ صدی میں اسلامی دعوۃ اور اسلامی تحریکات کے لیے گرانقدر اور منفرد خدمات سرانجام دی ہیں۔ خرم مراد انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز- اسلام آباد اور انسٹی ٹیوٹ آف لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ- لاہور کے بورڈ آف گورنرز کے رکن تھے۔ انہوں نے اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر (برطانیہ) کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر بھی دس سال سے زیادہ عرصے تک خدمات انجام دی ہیں۔ یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ آپ کو احیائے اسلام کی تحریک کے ابتدائی موئیدین، مددگاروں اور معماروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مراد ولفرڈ ہوف مین معروف نومسلم جرمن سکالر ہیں۔ آپ نے ہارورڈ لاء سکول سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ جرمنی کے دفتر خارجہ میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ برسلز میں ناٹو کے ڈائریکٹر انفارمیشن کے طور پر خدمات انجام دیں اور الجزائر اور مراکش میں جرمنی کے سفیر کی حیثیت سے بھی تعینات رہے۔ ڈاکٹر ہوف مین کئی اعلیٰ پائے کی کتب کے مصنف ہیں اور بین الاقوامی سطح کے کئی جریدوں میں مضمون نگاری بھی کرتے ہیں۔ ان کی کتب ''جرمن مسلمان کا روزنامچہ'' (*Diary of a German Muslim*)، ''اسلام واحد متبادل'' (*Islam: The Alternative*) اور ''مکہ کا سفر'' (*Journey to Makkah*) علمی، ادبی اور دعوتی حلقوں میں معروف و ممتاز ہیں۔ آپ نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے اور آپ کی کتب دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

خرم مراد یادگاری خطبات کے سلسلے میں ڈاکٹر ہوف مین نے اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں جو لیکچرز دیے ہیں، ان میں اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسلام آباد میں انہوں نے اسلام کے بارے میں مغربی اندیشوں اور مسلمانوں کے ردِعمل پر بات کی جبکہ لاہور میں تہذیبوں کے تصادم کے پورے مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کراچی کے لیکچر میں انہوں نے اسلام کو مستقبل کے نظریے کے طور پر دنیا کے سامنے ایک واحد متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ہوف مین کے خطبات سے جہاں اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے بہت سے گوشے روشن ہوئے ہیں وہاں مسلمانوں کے لیے غور و فکر کے بہت سے پہلو بھی سامنے آئے ہیں۔ جہاں کچھ غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں وہاں کچھ سوالات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے خود مسلمان معاشروں کے اندر بعض بڑے بنیادی مباحث کا دروازہ کھولا ہے اور مغرب کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی زیادہ بہتر تناظر میں سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر مراد ہوف مین ان موضوعات اوران کے مختلف پہلوؤں پر بات کرنے کے لیے بہت موزوں اور اہل دانشور ہیں۔ یہ محض اسلام اور مغرب کے درمیان ربط وتعامل اور کشمکش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دو تہذیبوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا ایسا سوال ہے جس سے پوری نوع انسانی کا مستقبل وابستہ ہے۔ آج ہمیں ایک بڑی منفرد صورت حال کا سامنا ہے، انسانی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ انسان ایک طرف تو ترقی کی معراج پر پہنچ چکا ہے اور زمان ومکان کی تسخیر کا دعویدار ہے۔ دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کے باوجود انسانیت آج ایک ایسے مقام پر آ کھڑی ہوئی ہے کہ اسے نہیں معلوم اس کو کہاں جانا ہے؟ اور اسی بے یقینی کے عالم میں گمراہی کی طرف رواں دواں ہے۔ اقتصادیات کے میدان میں ترقی کی رفتار اتنی تیز کبھی نہیں ہوئی۔ گزشتہ دو سو سالوں میں دنیا کی پیداوار میں تقریباً ۲۰۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی اکثریت غربت اور پسماندگی کا شکار ہے۔ دنیا کے چھ ارب انسانوں میں سے ۴۰ فی صد کے قریب لوگ خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دنیا کے ۲۲ ترقی یافتہ ممالک جن کا ۱۸۸۰ء میں دنیا کی پیداوار میں حصہ ۳۰ فی صد سے زیادہ نہیں بنتا تھا اور ان کے مقابلے میں پوری تیسری دنیا کا کل پیداوار میں حصہ ۷۰ فی صد تھا۔ آج یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ یہی ۲۲ ممالک آج دنیا بھر کی پیداوار کے ۸۷ فی صد وسائل کے مالک ہیں، اور صرف تین ارب پتی افراد کے پاس ۴۸ ممالک کی مشترکہ کل قومی پیداوار کے برابر دولت ہے۔

غربت اور استحصال محض تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کے امیر ترین ممالک بھی اس معاملے میں کوئی زیادہ اچھی مثال پیش نہیں کرتے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی امیر ترین ریاست کیلی فورنیا ہے جو دنیا کی ساتویں امیر ترین ریاست بھی ہے، یہاں بھی ۲۸ فی صد آبادی غربت کا شکار ہے۔ ہر تیسرا بچہ غربت میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہے اصل تہذیبی بحران۔ خاندان بکھر رہا ہے، جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے، تشدد اور نسلی منافرت اور امتیازی سلوک

عروج پر ہیں۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی روشنی میں ہم مسلم دنیا میں مغرب کے اس تہذیبی بحران کے اسباب واثرات کا جائزہ مغربی تہذیبی تفوق کے تناظر میں لیں گے۔

یہ موضوع خاص طور پر سوویت یونین اور کمیونزم کے زوال کے بعد انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں سرمایہ داری اور اشتراکیت، جمہوریت اور آمریت کے درمیان کشمکش جاری رہی اور کسی حد تک مسلم دنیا مغرب کا براہ راست ہدف نہیں تھی۔ اگرچہ اسلام کو غلط انداز میں پیش کرنا اور اس کے بارے میں اندیشوں کا شکار رہنا مغرب کا شروع سے ہی معمول رہا ہے۔ بایں ہمہ جہاد افغانستان نقطۂ تغیر ثابت ہوا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت کے جو بھی داخلی اور خارجی عوامل رہے ہوں، افغانستان میں جاری تصادم اور کشمکش کی نوعیت یہ تھی کہ ایک طرف دنیا کی ایک سپر پاور تھی اور دوسری طرف دنیا کا ایک انتہائی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک۔ اس کے باوجود وہاں لڑائی جاری رہی اور اس لڑائی کا جو افغانوں نے لڑی اخلاقی، قومی اور ملی جواز موجود تھا۔ یہ لڑائی بالآخر اسلام اور کمیونزم کے درمیان تصادم کی نوعیت اختیار کر گئی یعنی مسلم دنیا اور اشتراکی سپر پاور کے مابین۔ تاریخ کا یہ سنگین مذاق ہے کہ جہاد افغانستان کی کامیابی کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے افغان نہیں تھے چنانچہ اس جہاد کے بعد انہیں خانہ جنگی اور افراتفری کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاد افغانستان کے عواقب میں مشرقی یورپ متاثر ہوا، وسطی ایشیا میں تبدیلیاں آئیں، عظیم سوویت سلطنت انتشار کا شکار ہو گئی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کی واحد عالمی طاقت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا۔

جب یہ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں تو مغرب کو ایک نئے دشمن کی تلاش ہوئی۔ نیٹو کے سیکرٹری جنرل سے جب پوچھا گیا کہ اس کے کمرے میں ٹنگے ہوئے نقشے میں سے اب جب کہ سرخ رنگ ختم ہو رہا ہے تو اس کی جگہ کون سا رنگ لے گا؟ تو ان کا جواب تھا کہ سبز رنگ۔ آج دنیا کو جو نیا چیلنج درپیش ہے وہ یہ ہے کہ کمیونزم کے زوال کے بعد شہری جمہوریت (سول ڈیموکریسی) اور

مغربی سرمایہ دارنہ نظام کو واحد متبادل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اور اسی کو تاریخ کا اختتام قرار دیا جا رہا ہے۔ مغربی علماء، دانشور اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے جس نظریے یا علمی دعوے کو پروان چڑھایا وہ یہ تھا کہ یہ دور مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان تصادم کا دور ہوگا۔ ہارورڈ کے پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ لے کر سامنے آئے۔ انہوں نے دنیا کی آٹھ نمائندہ تہذیبوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اصل تصادم اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان ہے اور ممکن ہے اس تصادم میں اسلامی تہذیب کے ساتھ چینی تہذیب کا اشتراک وتعاون بھی شامل ہو۔ ایسا کرتے ہوئے اسلامی تہذیب کو ایک دشمن تہذیب قرار دیا گیا اور انتہا پسندی کے تمام تصورات بنیاد پرستی اور دہشت گردی وغیرہ کو اسلام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اسلام کو، اسلامی تہذیب کو، اسلامی تاریخ کو اور اس کے اصل جوہر کو حقیقی طور پر جانے اور سمجھے بغیر کیا گیا اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ دنیا میں اس وقت جتنی بھی آزاد مسلمان ریاستیں ہیں ان کی مجموعی کل قومی پیداوار صرف ایک ملک اٹلی سے بھی کم ہے۔ فوجی طاقت ہو یا سائنس وٹکنالوجی، مسلم ممالک اور یورپی ومغربی ممالک کے تناسب وتوازن میں بے انتہا فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام اور مسلم دنیا کو ایک دشمن کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں ڈاکٹر مراد ہوف مین کو ہم نے دعوت دی جو گو ایک مغربی ملک سے تشریف لائے ہیں لیکن اسلام کے عالمی عقیدے پر یقین رکھتے ہیں۔ اب ایک ایسی امت سے ان کا تعلق ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان تفریق کی قائل نہیں ہے۔ ہم ایک اللہ پر یقین رکھتے ہیں جو مشرق ومغرب کا مالک ہے۔ جو رب العالمین ہے۔ ہم ایسے پیغام میں یقین رکھتے ہیں جو قرآن کی آیات کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے اور جو امن اور انصاف کا علم بردار ہے۔ حتی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف اور بھلائی کا حکم دیتا ہے۔

مسلمانوں کا قریبی رابطہ غیر مسلموں اور مغرب کے ساتھ شروع ہی سے قائم ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے نصرانیوں اور یہودیوں سے سیاسی اور معاشی تعلقات کے علاوہ جب سپین میں مسلمان پہنچے تو اس ربط میں مزید اضافہ ہوا۔ پہلی صدی ہجری کے آخری عشرے میں مسلمان سپین میں بڑی طاقت تھے۔ غرض ہر دور میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے روابط رہے ہیں۔ مسلمان کولمبس سے بھی پہلے امریکہ پہنچے تھے۔ چنانچہ مغربی دنیا اور امریکہ ہمارے لیے انجان اور غیر معروف نہیں ہیں۔ یہ بڑی اہم پیش رفت ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور میں تقریباً دنیا کے تمام خطوں میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ہمارے نزدیک اسلام اور مغرب کے مابین تہذیبوں کا تعلق تصادم کا نہیں بلکہ یہ رابطہ اور اثر انگیزی کا مثبت مقابلہ ہے اور اس ترقی کے عمل میں اسلام کو بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے۔